ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
Vol. 3, No.2 (2021)
(April to June)

نظریہ پس نو آبادیت اور فرانزز فینن

Post-Colonial Theoryand Frantz Fanon

محمد امان اللہ خان
ریسرچ اسکالر، پی ایچ۔ڈی اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract:

Colonialism is strictly referred to the policies and Methods by an Imperial Power maintained and extended its control over the territories or People. A policy of extending a Country's Power and influence through diplomacy or military. It also affects the literature of the Subject Country which is controlled by the colonialist. The Policy or practice of acquiring full or partial Political control over another country, occupying it with settlers and exploiting it economically. A policy of extending a country's power and Influence through Diplomacy or military. He has passed much time under the rule of British Government and feel much trouble of thinking due to Colonial system upon the people of Africa, Hindustan and Pakistan. His Books: Black Skin and white Masks, a dying Colonialism and the wretched of the Earth are most important to understand the theory of Post Colonialism and its impacts on people of Africa and Asia. One of his books is translated in Urdu with name of افتادگانِ خاک by Sajad Baqar Rizvi in Pakistan. He Clearly gives the showing glance of Colonial System and Colonialized Areas and People of Colony. This Article presents a brief history of Post Colonial Studies of Edward Said and Frantz Fanon.

Key Words: Edward Said, Frantz Fanon, Orientalism, Consumer Values, Exploitative Behaviors

کلیدی الفاظ: ایڈورڈ سعید، فرانز فینن، شرق شناسی، افتادگانِ خاک، صارفی اقدار، استحصالی رویے

پس نو آبادیاتی مطالعہ میں جن سیاسی و سماجی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی، علمی و ادبی مباحث کو مرکزی دھارے میں لایا گیا ان میں عالم گیر حربے، صارفی اقدار، اقوام کی ذلت، نسوانی طبقات اور سامراجی طرز حکومت کے سبب نو آبادیاتی ثقافتوں میں پیدا ابھرنے والے تغیر و تبدل، اس کی نشو و نما اور ارتقاء کے مخصوص زاویوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ اس قسم کے مطالعہ کی نظریاتی بنیادوں پر مشرق و مغرب کے چند اہم دانش وروں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس ضمن میں ایڈورڈ سعید (1936ء-2003ء) کی کتاب "شرق شناسی"(Orientalism) اہم ترین کاوش ہے۔ اس کتاب میں ایڈورڈ سعید نے اسلامی دنیا کے بارے مغربی طرز فکر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ خاص طور پر مظلومین کے حق میں انتہائی مضبوط دلائل سے بات کی ہے مغربی اقوام کی مشرقی اقوام پر بالادستی، مزاحمت کاری، عمل داری، مغربی اقوام کی نسل پرستی، بیانیے اور بطور خاص مشرقی اقوام کی تاریخ مسخ کرنے جیسی پالیسیوں پر اپنے علمی بساط کے مطابق خوب بحث کی ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی کئی دیگر کتب میں پس نو آبادیاتی بیانیے کی وضاحت کی ہے اس کی اہم ترین کتب ہیں۔

1. The Question of Palestine
2. Covering Islam
3. After the last sky

4. Blaming the victims

5. Culture and Imperialism

6. Literature and Society

7. The Pen and the Sword

8. The world the text the critic

Covering Islam، the Question of Palestine اور After the Last sky ان تینوں کتب میں عرب دنیا خاص فلسطینی عوام کے مسائل کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ ایڈورڈ سعید کے فکری نظام میں جن دیگر شخصیت کا عکس ملتا ہے اس میں جوزف کونارڈ کی فکر واضح نظر آتی ہے جوزف کونارڈ خود بھی مغربی سامراجیت کا انتہائی مخالف تھا۔ ایڈورڈ سعید عربی، فارسی اور انگریزی ادبیات پر مہارت نامہ رکھتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے ان زبانوں کے علمی اور ادبی مباحثوں اور ذخیروں کا بہ خوبی جائزہ لیا اور ان میں در آنے والے استعماری و استحصالی رویوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔ انگریزی زبان و ادب پر کڑی تنقید کرتے ہوئے معروف ناول نگار Jane Auston کے ناول Pride and Prejudice کو اپنے نشانے پر لیا۔ اسی طرح ردیا ڈ کپلنگ کے نام "Kim" کے ساتھ دیگر افسانوی تحریروں کو بھی سامراجی استعمار کی کڑیاں قرار دیا۔ تہذیب و تمدن کی بنیادی قدروں اور ان قدروں پر سامراجی اثرات کے جائزہ کے لیے ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "ثقافت اور سامراج" Culture and Imperialism لکھ ڈالی۔ اس کتاب میں مختلف زبانوں کے ادبی متون کو بطور سند کے پیش کیا ہے۔ ایڈورڈ سعید کی ناقدانہ رائے میں سیاسی فکر و فلسفے، معاصر حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ تہذیب کے سماجی و ثقافتی رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ایڈورڈ سعید کے ان تجزیات کو گزشتہ دو سے اڑھائی سو سال کے سامراجی و استعماری نظاموں کے حوالہ سے لاجواب سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مطابق نو آبادیات کے مقتدر طاقتیں اپنی محکوم آبادیوں کو بے بس، لاچار اور کم زور بنانے کے لیے ان کی معاشرتی، ثقافتی، تاریخی، لسانی علمی، عملی، سماجی اور سیاسی قدردوں سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرتی ہیں اور یہی واقفیت ان کے لیے طاقت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ معروف و مشہور فلسفی او رمفکر نطشے کا نظریہ علم "Knowledge is Power" کو نو آبادکاروں کے نو آبادیاتی نظام کا لازمی حصہ سمجھا گیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اس فلسفے کے انقلا ب پر ور تصور کو "Knowledge is colonialism" میں استعمال کر کے استعماری و سامراجی نظام کے استحصالی رویوں اور حکمت عملیوں سے پر دہ اٹھایا ہے۔ ان کے خیال میں نو آبادیاتی نظام ایک مدغم دنیا ہے جس میں دنیا کے مختلف علاقوں کے ثقافتی و سیاسی، سماجی و معاشی، معاشرتی اقتصادی قدریں اور رویے باہم مل کر نئے نئے معاشرتی رویے تخلیق کر رہی ہیں اور یہ سلسلہ آہستہ آہستہ باقاعدہ ایک عالم گیر نظام کی طرف جاتا محسوس ہو رہا ہے اس عالم گیر سلسلہ کو قائم کرنے کے لیے کئی قوتیں متحرک ہو کر اجتماعیت کا سامان کر رہی ہیں:

> "عالم گیریت کا تصور سب سے پہلے میکلوہن (Maclauhan) نے 1968ء میں The Global Village کی اصطلاح استعمال کر کے علمی دنیا میں متعارف کرایا"۔(۱)

ایڈورڈ سعید یورپی سامراجیت کے دور پر بحث کرتے ہوئے اپنے مؤقف میں بیان کرتے ہیں کہ یورپی مغربی استعمار اور سامراجیت کی شروعات انیسویں صدی کے صنفی عہد سے ہوتیں ہیں۔ اس کے مرکزی کردار فرانس اور برطانیہ تھے۔ ان قوتوں نے اپنے مقتدر بیانیے کے زور پر اپنے سے کم تر او رکم زور اقوام پر غلبہ حاصل کر کے ان کے زمینی، زرعی، معاشی، اقتصادی وسائل پر قبضہ کیا اور ان وسائل سے حاصل ہونے والے خام مال کے ساتھ ساتھ افرادی قوت بھی حاصل کی اور اپنی معاشی بنیادوں کو مضبوط تر بنایا۔ محکوم طبقہ علمی سرپرستی اور تہذیبی ترقی کے نام پر بھی ان سامراجی اور استعماری طاقتوں کے سبب استحصال کا شکار ہوا۔ اس استحصال نے دیگر معاصر تاریخی بیانیے کی معروضیت کو بے دردی سے پامال کیا اور اس کو مسخ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی بیسویں صدی میں طاقت کے نشے سے بھرپور ان سامراجی طاقتوں نے پوری دنیا کو اپنے ماتحت کرنے کے خواب دیکھے اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے طاقت کا اندھا دھند استعمال کیا نتیجہ یہ نکلا کہ عالم گیر جنگوں کے سبب سامراجی اور یہ استعماری نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا اور بیسویں صدی کے آخری ربع تک تمام نو آبادیاتی آبادیاں اور محکوم اقوام آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ البتہ سرد جنگ میں مشترکہ طاقتوں کے ناکام ہونے پر تیسری دنیا ایک نئی قسم کی نو آبادیاتی صورت حال سے دوچار ہو گئی ہے۔ اسی نئی نو آبادیاتی دنیا اور نئے نظام میں امریکہ کو یک قطبی قیادت بن کر

ابھرا۔ موجودہ دور میں نئے نو آبادیاتی، سامراجی اور استعماری نظام کے استحصالی اثرات پہلے نو آبادیاتی نظام سے کہیں زیادہ خطرناک اور تشویش ناک صورت حال اختیار کر چکے ہیں جس کی زندہ مثال افغانستان، عراق، شام، فلسطین، کشمیر، یمن اور برما جیسے علاقوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ایڈورڈ سعید نے فلسطینی عوام کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے حق گوئی کا ساتھ دیا اور اپنے ہی ملک کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ 1980ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب "Covering Islam" میں انہوں نے مسلمانوں کی مظلومیت کا مقدمہ بڑی جرأت مندی سے لڑا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مغربی مفکرین، فلاسفروں اور دانش وروں کی طرف سے اسلام کی مسخ کر کے پیش کرنے پر سخت تنقید کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت کی طرف سے شروع کیے جائے نئے نو آبادیاتی، سامراجی اور استعماری ایجنڈے کا پردہ چاک کرتے ہوئے اس کی استحصالی کارروائیوں کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ مزید براں یہ کہ اسی فکری و تنقیدی تناظر میں ۹/۱۱ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر حملوں کو بھی امریکہ اور اسرائیل کی ذاتی منصوبہ بندی اور استعماری کارروائیوں کا شاخسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

پس نو آبادیات مطالعہ دنیا کے اکثر علاقوں میں واقع ہونے والی نو آبادیاتی صورت حال اور اس سے قائم ہونے والے سماجی، سیاسی، ثقافتی، علمی و ادبی رشتوں کو واضح کرتا ہے یہ رشتے عموماً نو آبادکار قوتوں اور ان کی محکومین کے مابین قابض اور مقبوض ہونے کے ناطے کو واضح کرتے ہیں۔ نو آبادکار اور نو آبادی کے باشندوں کے مابین مزاحمت اور مفاہمت کی اکثر صورت ان مخصوص مفادات کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کے سبب نو آبادکار ان مقامی آبادیوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہوتا ہے۔ نو آبادکار اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے ایسے بیانیے تشکیل دیتا ہے جو ان کے ان آبادیوں پر کنٹرول اور قیام کا جواز فراہم کرتے ہیں یہی بیانیہ اکثر و بیشتر ایک خوف کی طرح مقامی آبادیوں کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں جن کے اثرات سے باہر آنے کے لیے مقامی باشندوں کو صدیوں پر محیط سفر طے کرنا پڑتا ہے اور اس سارے سفر میں نسلوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ پس نو آبادیاتی مطالعہ، نو آبادیاتی دور میں تشکیل پانے والے ایسے ہی بیانوں کو دنیا کے سامنے لانے کی کاوش ہوتی ہے۔ سیاسی، علمی و ادبی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، معاشی، ثقافتی، سائنسی سطح پر سرایت کر جانے والی بہت ساری تبدیلیاں، جن کا اکثر نو آبادکار مقامی باشندوں کے لیے انقلاب کی راہ قرار دے چکا ہوتا ہے اور ان کے ترقی کے سہانے خواب دکھا چکا ہوتا ہے۔ دراصل اپنی طاقت اور اقتدار کو مضبوط کرنے اور برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں اردو زبان و ادب میں پس نو آبادیاتی مطالعہ کے آغاز کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس حوالہ سے جو تحریریں منظر عام پر آئیں ہیں ان میں ایڈورڈ سعید کی کتب شرق شناسی، ثقافت اور سامراج، Covering Islam کو اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔

فرانز فینن پس نو آبادیاتی مطالعہ کے پہلے پہلے مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جو فکری نظریات و تصورات انھوں نے پیش کیے ہیں اردو ادب ان پر کم توجہ کی گئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند پر انگریز سامراج کے دور میں تخلیق ہونے والے ادبی متون کو فینن کے نظریاتی تناظر میں انگریزی نو آبادیاتی نظام کو باآسانی دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ طاقت کے وہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی مظاہر کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی متون جن کے ذریعے ان نو آبادکاروں نے صوبوں میں رائج نظام حکومت، رسوم اور رواج، اقدار و روایات اور زبان و ادب کو اچھی طرح پرکھا جاسکتا ہے، فرانز فینن نے نو آبادیاتی دور کی صورت حال کے زمرے میں جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے ان میں خاص اقتصادی اور معاشی صورت حال کو معاشی و اقتصادی سطح پر کم زور قوموں اور طاقت ور اور زور آور قوموں کے مابین موجود باہمی کش مکش سے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ تمام اقوام و ممالک جو کبھی کسی نہ کسی صورت میں نو آبادیاتی، سامراجی یا استعمارات کا حصہ رہے ہیں، آج بھی نفسیاتی، معاشی، اقتصادی طور پر مکمل آزادانہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نو آبادیاتی دور کے قائم کردہ بیانیے نے اپنے اثرات اتنے پختہ انداز میں ثبت کیے ہیں کہ آج بھی نو آبادیاتی دور کی محکوم اقوام بالواسطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی محسوس ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں نو آبادیاتی غلامی سے آزادی حاصل کرنے والے دونوں ممالک ہندوستان اور پاکستان بہ طور مثال ہیں۔

نو آبادیاتی دور کی غلامی سے نجات حاصل کیے ستر سال سے زائد عرصہ بیت چکا ہے لیکن پھر بھی نو آبادیاتی دور کی تہذیب و ثقافت، زبان، لباس، قانون، آئین علمی و ادبی نظریات، تعلیمی پالیسیاں جوں کی توں ہیں۔ فرانز فینن کے فکری نظریات سے صرف افریقی نو آبادیاتی آبادی کی ہی نشان دہی نہیں ہوتی بل کہ سامراجی نظام کے مد مقابل مزاحمتی بیانیے بھی سامنے آتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں قائم نو آبادیاتی نظام میں فینن کی فکر اسی لیے

حقیقت کے زیادہ قریب ہے کہ اس میں ان درجات کو بہ آسانی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جن کو طے کرنے کے بعد محکوم طبقات کے افراد غلامی کی زنجیروں کو اتار پھینکنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی دور کے ان کرداروں کا بھی اصل چہرہ سامنے آجاتا ہے جو دراصل مقامی آبادی کو آزادی دلانے کی آڑ میں اپنے اپنے ذاتی مفادات کی جنگ لڑتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قوم میں منافقانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے۔

فرانز فینن کی پہلی کتاب 1952ء میں منظر عام پر آئی جس کا نام Peau Noire Masques Blancs ہے۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ Black skin white masks کے نام سے کیا گیا۔ یہ کتاب افریقی نسل کے محکوم باشندوں کی نفسیات پر نو آبادکاروں کی طرف سے مرتب ہونے والے منفی اثرات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں افریقی باشندوں کے نفسیاتی جائزوں کو سامنے رکھتے ہوئے سامراج کی کھینچی گئی ان لکیروں کا واضح عکس دیکھا جاسکتا ہے جن کے تحت مغلوب و محکوم اور مظلوم باشندے ذہنی، نفسیاتی اور روحانی اذیتوں کا شکار ہو جاتے ہیں دراصل یہ کتاب فرانز فینن کے ان تجربات کی یادگار ہے جو انھوں نے الجیریا کے ایک ہسپتال میں سامراجی و استعماری ظلم و تشدد کا نشانہ بننے والے مظلوم افراد کے نفسیاتی معالج کے طور پر کیے۔ واضح رہے کہ الجیریا کو فرانسیسی استعمار کاروں نے اپنی استعماریت اور نو آبادیت کے نظام میں عرصہ دراز تک محکوم و مغلوب بنائے رکھا۔ ایک نفسیاتی معالج ہونے کے ناطے فینن نے اپنی تہذیب و ثقافت کے حوالہ سے ایک نبض شناس کے طور پر کام کیا یہی وجہ ہے کہ فینن کے نو آبادیاتی مطالعات میں اولین مقام حاصل ہے۔

فینن کے خیال میں سامراجی اور نو آبادیاتی قوتوں کی طرف سے متعارف کرائے بیانیے مقامی باشندوں کی سیاسی و ثقافتی، تہذیبی و تمدنی، علمی و فکری، ادبی و تخلیقی، سماجی و معاشرتی، معاشی و اقتصادی رویوں کو اس طرح رونڈ ڈالتے ہیں کہ مقامی آبادی کا ہر فرد ایک وجودی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور احساس کم تری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نو آبادکار کی طرف سے مقرر کردہ یہ نسلی شناخت جو مقامی باشندوں جو جہاں احساس کم تری میں مبتلا کرتی ہے وہاں ان مقامی باشندوں کو خود کو ذات کی از سر نو دریافت کے لیے سوچ اور فکر مہیا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ افریقی مقامی باشندے خود کے چہرے پر ایسا ماسک / خول چڑھانے پر مجبور ہوئے جس کے سبب وہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، علمی، فکری اور معاشی سطح کی ترقی کے لیے اپنے نو آبادکاروں کے قریب ہوئے۔ برصغیر پاک و ہند بھی نو آبادیاتی دور میں اپنے نو آبادکاروں اور مقامی باشندوں کے درمیان اس قسم کی مقبولیت اور مزاحمت کے عمل سے گزر چکا ہے اور نو آبادیاتی دور کی ایسی کارگزاریاں ہر گز ڈھکی چھپی نہ ہیں۔ فینن نے افریقی باشندوں کے لیے نسلی بنیادوں پر نیگرو (Negro) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جو دراصل ایک تخصیص ہے کہ اس سرزمین پر باقی ماندہ افراد کو نو آبادکار نے اپنی من مانی کی شناخت مہیا کی ہے۔ فینن اس پیچیدہ نو آبادیاتی حربے سے بچنے کے لیے مقامی باشندوں کو اپنی مقامی ثقافت سے جڑے رہنے اور اسی پر قائم رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کے خیال یہی وہ عمل ہے کہ جس کے سبب مقامی باشندے نو آبادکاروں کے غالب آنے والے تہذیبی و ثقافتی حربوں اور نسلی تفاخر و منافرت کے مدمقابل کوئی مزاحمتی بیانیہ پیش کر سکتے تھے۔

فینن کی دوسری کتاب (A Dying Colonialism (L' Ancinq میں مقامی باشندوں اور حاکم نو آبادکاروں کے درمیان باہمی کش مکش کو بیان کیا گیا ہے۔ مزید برآں ان مدارج کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کو طے کر لینے کے بعد کوئی بھی قوم کسی سامراج کی غلامی کی زنجیروں سے آزادی حاصل کر لیتی ہے اس کتاب کا بنیادی موضوع فرانسیسی نو آبادکاروں اور الجیریا کی مقامی آبادی کے باشندوں کے درمیان جاری کش مکش کا بیانیہ ہے جس نے بکھرے ہوئے مقامی افراد کو نو آبادکاروں کے ظلم و تشدد کے خلاف اکٹھا ہونے اور مزاحمتی تدبیروں کا سامان کیا ہے۔ فینن کے نزدیک جب مقامی باشندے ہر قسم کی طبقاتی تقسیم سے صرف نظر کرتے ہوئے آزادی کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ان کے سامنے ظالم، جابر اور متشدد حکمرانوں کی حیثیت "کائی" کی سی ہوتی ہے۔ اس اجتماعیت کے ساتھ ساتھ مختلف ذرائع ابلاغ بھی استعمار کار کے ظلم و تشدد اور جبر کے خلاف شعور اجاگر کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ ذرائع ابلاغ برقی رو کا کردار ادا کرتے ہوئے مقامی افراد میں بجلیاں پیدا کرنے کا بھی سبب بنتے ہیں۔ فینن کے مطابق یہ دونوں ذرائع ابلاغ نو آبادکاروں کے ظلم و استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے آزادی کی جنگ میں مقامی مجاہدین آزادی کی آواز بن کر ان کی پکار کو دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ ہندوستان کی صورت حال کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا جائے تو ہندوستان کے نو آبادیاتی دور میں بھی اخبارات، رسائل، جرائد اور مقامی باشندوں کے جلسے جلوس اور ان میں پیش کردہ مزاحمتی بیانیے اور اس بیانیے کے عوض اپنی طلب نے آزادی کی راہ ہموار کرنے میں اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے۔

زمیندار، چٹان، اودھ پنچ اور ہلال جیسے رسائل و جرائد نے برطانوی نو آبادکاروں کے خلاف مزاحمت اور ان کے خلاف رائے عامہ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز سامراج کی طرف سے مختلف پابندیوں، سزاؤں اور جرمانوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ فینن کے خیال میں جہاں یہ ذرائع ابلاغ مقامی افراد کے مرد حضرات میں جذبہ حریت پیدا کرتے ہیں وہاں یہ ذرائع ابلاغ مقامی عورتوں کو بھی تحریک آزادی میں شامل ہونے کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان ذرائع ابلاغ کی چھان پھٹک سے جب تحاریک آزادی کی مرقوم داستانیں عام لوگوں کی دسترس میں آئیں تو وہ لوگ جو ان نو آبادیاتی نظام کے استحصال کے خلاف صف آراء ہوئے تھے عوام کی نظر میں قومی ہیروز ٹھہرے۔ فینن نے یہ بھی واضح کیا کہ تحریک آزادی کی جدوجہد میں نو آبادکاروں کی طرف سے متعارف کیا جانے والے بیانیہ بالآخر معدوم ہو جاتا ہے جن کا مقصد مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینا اور مقامی باشندوں کو ان کی مقامی روایات اور رسوم و رواج سے محروم کرنا ہوتا ہے۔ مقامی باشندوں کی تہذیب و ثقافت نو آبادکاروں کی طرف سے تھوپی گئی تہذیب و ثقافت کے سامنے اپنی مزاحمت جاری رکھتی ہے اور آخر کار سامراجی اور نو آبادیاتی تہذیب و ثقافت کو جزوی یا مکمل بے دخل کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتی ہے۔ فینن کے الفاظ میں:

> "کسی بھی تہذیب کے بعض ستون انتہائی طاقت ور ہوتے ہیں جن کے سہارے وہ کھڑی ہوتی ہیں، انہیں اس قدر آسانی کے ساتھ نہیں ہلایا جا سکتا۔ جب کہ استعمار نواز حلقوں کو مبالغہ آرائی کی حد تک اپنی کامیابی کی توقع ہوتی ہے"۔(۲)

فینن نے اپنی اس دوسری کتاب میں تحریک آزادی کے دوران پیش آنے والی لسانی صورت حال پر دل کھول کر گفتگو کی ہے اس کی تحقیق کے مطابق سامراجی قوتوں کی متعارف کردہ زبان جو کہ مقامی باشندوں کے لیے ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت میں ہوتی ہے، بالآخر آزادی کے لیے ایک ذریعہ بن جاتی ہے اور ایک آلہ کا کام دیتی ہے۔ مقامی لوگ جب بدیسی زبان سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں تو بین الاقوامی سطح پر اپنا پیغام پہنچانے کے لیے اسی بدیسی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور یہی حکمران زبان ان کے لیے ایک ہتھیار بن جاتی ہے۔ اسی بدیسی زبان کو استعمال کرتے ہوئے سامراجی استحصال اور ظلم و ستم کے خلاف ملکی و غیر ملکی اخلاقی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز سامراج کے آجانے سے مقامی آبادی نہ صرف انگریز سے نفرت کرتی تھی بل کہ ان کی زبان سے نفرت کرتی ہے اور اس کو ناپسند کرتی ہے۔

ابتدائی طور پر برصغیر پاک و ہند میں بھی مقامی باشندوں نے انگریزی زبان سے اس حد تک احتراز کیا کہ مقامی علماء کرام نے انگریزی زبان کے سیکھنے کو کفر قرار دے دیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کے افراد نے استعمارات کے استحصالی ہتھ کنڈوں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے نہ صرف انگریزی کو سہارا بنایا بل کہ اسی زبان کی وساطت سے اپنے مسائل دنیا کے سامنے رکھے جس سے ان کے سیاسی و ملی شعور میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہی ایک بنیادی سبب تھا جس نے ہندوستان کے باشندوں کو انگریز سرکار کے خلاف اکٹھا ہونے پر مجبور کیا اور انھوں نے اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے "اے ہیوم" نامی شخص کی سرپرستی میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد 1885ء میں رکھی۔ اسی پلیٹ فارم نے ہندوستان کے لوگوں میں حقیقی رد استعمارات پیدا کیا گیا اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ہندوستان میں جہاں انڈین نیشنل کانگریس کا وجود آیا وہاں مسلم لیگ کا قیام بھی اسی سلسلے کی کڑی ثابت ہوا تھا۔ 1906ء میں قائم ہونے والی سیاسی جماعت مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن کر ابھری۔ یوں کانگریس اور مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں کے قیام سے مقامی آبادی کی اجتماعیت نے نو آبادکاروں کے عزائم کو خاک میں ملانا شروع کیا اور آزادی اور انقلاب کے نعروں کی گونج بین الاقوامی ایوانوں تک پہنچی۔ نوجوان قیادت یورپ کے بڑے بڑے تعلیمی اداروں سے تعلیم مکمل کر کے لوٹی تو اسی استعماری زبان کو بہ طور ہتھیار استعمال کیا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ زبان و ادب نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔

فینن کی کتاب The Wretched of the Earth کا ترجمہ مارچ 1916ء میں سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز نے کیا۔ فینن کی اس کتاب نے علمی دنیا میں استعماریت اور سامراجیت کا اصل چہرہ بے نقاب کیا۔ اس کتاب میں فینن نے یہ نظریہ دیا ہے کہ نو آبادیاتی دنیا ثنویت کے تصور پر قائم ہے اور اس نظام میں سارا زور اسی بات پر ہے کہ ایک خاص نسل، رنگ، ملک، علاقے اور مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو دنیاوی وسائل پر اپنے مقاصد کی

تکمیل کے لیے پورا حق ہے جب کہ ان کے برعکس کسی دوسری نسل، علاقے، رنگ اور مذہب کے افراد ان کے ماتحت ہیں فینن نو آبادیاتی صورت حال کو ایک قسم کی اقتصادی صورت حال سے تشبیہ دیتا ہے۔ فینن کے مطابق:

> "نو آبادیاتی صورت حال کی اصل جدت وہ اقتصادی حقیقت ہے جس میں اتنی شدید معاشی ناہمواری او رطرز زندگی کا اتنا بڑا فرق ہوتا ہے کہ انسانی صورت حال کی اس قدر پردہ پوشی کسی اور طریقے سے کبھی نہیں ہوتی..... نو آبادیات میں اقتصادیات کا زیریں نظام بھی ایک بالائی نظام ہوتا ہے۔ سبب ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ دولت مند ہیں اس لیے آپ سفید فام ہیں، آپ سفید فام ہے اس لیے کہ آپ دولت مند ہیں"۔(۳)

فرانز فینن کے درج بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نو آبادیوں کے مقیم باشندے نو آبادکاروں کی طرف سے مسلسل استحصال کا شکار ہو کر بالآخر ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ احساس کمتری صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے جب انسان کو شرف آدمیت برابری کی سطح پر ہو۔ اسی بنا پر نو آبادکار اپنا نظام ثنویت کے تصور پر قائم کرتا ہے تاکہ اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکے۔ پہلے پہل مفاہمتی پالیسیوں کے مطابق مقامی، باشندوں کے دل میں احسان اور شکر گزاری کے جذبات اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بعد ازاں استعمار کار اپنی چالاکیوں اور منافقانہ چالوں کے ذریعے اپنے اور مقامی باشندوں کے درمیان موجود تہذیبی و ثقافتی، علمی و ادبی، سیاسی و سماجی اور علمی و فکری بُعد پیدا کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے یوں وہ مقامی آبادی اور خود کے درمیان دو دنیاؤں کیا یک الگ ذہنی ساخت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خود کو اعلیٰ اور مقامی آبادیوں کو ادنیٰ تر تصور کر لیا جاتا ہے۔ فرانز فینن کے مطابق اس دنیا کی تقسیم نسلی امتیاز کی بنیاد پر ہے۔ مغربی لوگوں کے ہاں مشرقی باشندوں کے لیے ایک خاص قسم کی کشش ہے وہ یہ کہ مغربی لوگ خود کو دنیا کی اعلیٰ ترین نسل اور حکمران تصور کرتے ہیں جب کہ باقی تمام دنیا کو اپنا غلام اور محکوم خیال کرتے ہیں اور ان غریب طبقوں پر حکومت کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہی رویے مقامی باشندوں میں ہمہ وقت ایک اعصابی اور ذہنی ہیجان پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ نو آبادکاروں کو ہمیشہ اپنے ان رویوں کے سبب مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اسی مزاحمت کے سبب نو آبادکار ہمہ وقت مقامی تہذیب، ثقافت، سماج، معاشرت او رمذہب سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔ یہ کشش گریز، انجذاب و انحراف، مفاہمت و مخاصمت کے دو رویہ جذبات صرف نو آبادکار اور مقامی باشندوں کی زندگیوں کو ہی نہیں بل کہ ان کے خیالات اقدار و روایات، تحریر و تقریر اور رسوم و رواج غرض ہر چیز کو متاثر کرتے نظر آتے ہیں۔ نو آبادکاروں اور استعماری طاقتوں کی طرف سے مستعمل اصطلاحات "ہم" اور "وہ" اعصاب پر اس حد تک اثرات مرتب کرتی ہیں کہ مقامی باشندے نو آبادکاروں کے استعمار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان جیسا بننے کے خواب بھی دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

فینن نو آبادیاتی صورت حال کے سمجھنے کے لیے علمی سطح پر مقامی لوگوں کے علمی سرمائے کا تجزیہ کرنا لازمی خیال کرتا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ نو آبادیاتی صورت حال کو رد کرنے کے لیے مقامی باشندوں نے نو آبادیاتی بیانیے کو کس طرح رد کیا یا اس کو اپنا لیا۔ وہ کون سے ذہنی عوامل تھے جنھوں نے "وہ" اور "ہم" کا فرق پیدا کیا اور اس کے لیے ذہنی فضا تیار کی۔ آخر کیوں استعمار کار اپنی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کو اعلیٰ ترین خیال کر کے اپنا فکری نظام رائج کرنا چاہتے تھے۔ وہ کون سی وجوہات تھیں جن کے تحت نو آبادکار اور اس کی تہذیب و ثقافت سے مخاصمت کی بجائے مفاہمت کی راہیں نکلتی تھیں۔ فینن کا خیال تھا کہ بعض مقامی ادیب و مفکر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استعماری سرمایہ داروں سے کوئی نہ کوئی خاص تعلق رکھتے ہیں اسی تعلق کے نتیجے میں ان ادیبوں کی تحریروں میں استعماری طاقتوں کے بیانیے، تاریخ، خیالات، نظریات اور تہذیب و ادب کے روشن پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ فینن کے خیال میں ان مقامی ادیبوں اور مفکرین نے بڑے عہدوں اور خطابات کے حصول کے لیے اپنے خاص تعلق کو نو آبادکاروں اور استعماری طاقتوں سے استوار کیے رکھا۔ برصغیر پاک و ہند کے نو آبادیاتی دور کے لکھے جانے والے ادبی سرمائے میں ایسی تحریریں مل جاتی ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف سامراجی حکمرانوں کی قربت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جو ادب تخلیق ہوا وہ جہاں مزاحمتی تھا وہاں ایسا ادب بھی تخلیق کیا گیا جس کا مقصد صرف اور صرف انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنا اور انگریزوں کی قربت تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو مقامی زبان سے متعارف کرانا بھی مقصود تھا۔ ان تحریروں میں نہ صرف انگریز کو ایک نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا بل کہ اس کے مقابل مقامی حریت پسندوں کو

اوباشوں، لیٹروں، جور، ڈاکوؤں جیسے القابات سے نوازا گیا۔ اس وقت کے مقامی تخلیق کاروں اور شاعروں نے اپنی جان بچانے اور ذاتی مفادات لینے کی خاطر نئے حکمرانوں سے مفاہمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس نو آبادیاتی دور کی لکھی ہوئی تحریریں سنہرے دور کی ایک علامت کے طور پر ابھرتی ہیں۔ ان تحریروں میں نو آبادکار کی طاقت اور قوت کے رعب کو ایک مسیحائی کا انداز دیا گیا ہے۔ ایسا نجات دہندہ جسے قدرت نے تباہ حال قوم کی اصلاح اور خوش حالی کے لیے بہ طور تحفہ اور انعام بھیجا ہو۔ نو آبادیات کے عہد میں نو آبادکاروں کے بنائے ہوئے قوانین، اصلاحی ایجنڈے اور ادب پروری غرضیکہ ہر چیز کو صرف اور صرف ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنی تہذیب و ثقافت، رسوم و رواج، علم و ادب روایات و اقدار اور سیاسی و سماجی شناخت کو نو آبادکاروں کے ہاں گروی رکھوا کر ہی کوئی قوم اپنی شناخت، قومیت اور آزادی کے مفہوم کی حقیقت سے واقف ہوتی ہے۔ فینن قومیت کا یہی شعور مقامی افراد میں نئے سرے سے پیدا کرنے کے بعد آزادی کی تحریک پر آمادہ کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

> "عوام جو اپنے پیدائشی حقوق کھو چکتے ہیں، خود خانہ جنگی اور عداوتوں کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں رہنے کے عادی ہو چکتے ہیں۔ اب مختلف علاقوں میں قوم کے چہرے کو صاف اور شفاف کرنے کے لیے قیامت کی فضا میں آگے بڑھتے ہیں"۔(۴)

درج بالا بیان نو آبادیوں کے مقامی باشندوں کی اس بے ساختگی کو ایک قوت سے تعبیر کرتا ہے۔ ان مقامی لوگوں کا یہی شعور ظالم و جابر سامراج کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی قوت فراہم کرتا ہے۔ آپس کے اختلافات کو بھلانے اور اتحاد پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ اتحاد اور اجتماعیت ہی سامراج سے آزادی حاصل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے لحاظ سے میثاق لکھنؤ وہ وقت تھا جس نے ہندوستان کے لوگوں میں انگریز سامراج کے خلاف مشترکہ جدوجہد اور انگریز کے جاری کردہ ظلم و ستم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس مشترکہ جدوجہد کو حقیقی معنوں میں قومی شعور کی بیداری کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہوم رول، تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات تک مقامی آبادی جس انداز میں انگریز سامراجی قوت کے خلاف متحد ہو گئی تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب آزادی کی منزل زیادہ دور نہیں لیکن گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کا حامی ہونے اور سانحہ چوراچوری میں مقامی باشندوں کے ہاتھوں ایک تھانے پر دھاوا بولنے کے سبب تحریک ترک موالات کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا واضح رہے کہ چوراچوری کے سانحہ میں مقامی افراد کے ہاتھوں تھانے آگ لگا دی گئی تھی جس کے نتیجہ میں ۲۲ کے لگ بھگ سپاہی جل کر ہلاک ہو گئے تھے۔ گاندھی جی کی طرف سے تحریک ترموالات کے خاتمے کے بعد ایک مدت تک مسلمان اور ہندو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے نہ ہو سکے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کی منزل کوسوں دور چلی گئی۔

فینن کے ہاں نو آبادیاتی نظام میں نو آبادکاروں کے ظلم و تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے متشدد مزاحمت اس وقت ناگزیر ہو جاتی ہے جب کوئی اور چارہ باقی نہ رہے۔ نو آبادکار ہمیشہ مختلف قوانین اور طاقت کے اندھا دھند استعمال سے جب مقامی آبادی تحقیر کا نشانہ بناتا ہے اور موقع بہ موقع عزت نفس کو مجروح کرتا ہے۔ اس عمل سے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مقامی آبادی کے افراد کی حیثیت کسی جانور کی سی ہے۔ نو آبادکاروں کی طرف سے وضع کردہ مخصوص اصطلاحیں جیسا کہ نیگرو (Negro) اور نیٹو (Native) ان کی مخصوص ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان اصطلاحوں کے ذریعے نو آبادکار مقامی افراد کے ذہنی اور جسمانی استحصال کا حق اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ مسلسل استحصال، ظلم و ستم، بربریت اور جانوروں سے بھی بدتر سلوک برداشت کرنے کے بعد کسی بھی نو آبادی کے باشندوں کی طرف سے تہذیب و شائستگی اور امن و سلامتی کے لہجے کی امید رکھنا پرے کا خیال ہے۔ ظلم و ستم بربریت اور استحصال کی اس صورت حال میں تحریک آزادی کی کاوش اور اس جدوجہد کے دوران کسی بھی گروہ سے بھڑکنے والی تشدد کی کوئی ایک چنگاری پورے سماج کو آناً فاناً آگ کے جنگل میں بدل دیتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران واقع ہونے والے کئی ایک واقعات اسی آگ کی چنگاری کا کام کر گئے جنھوں نے برصغیر پورے کو خاک و خون میں نہلا دیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر 1857ء کی جنگ آزادی میں برصغیر پاک و ہند کی جملہ آبادی اور سیاسی و سماجی گروہ مشترکہ متشدد مزاحمت کی راہ اختیار کرتے تو تاریخ کی سمت کسی اور طرف ہوتی اور حالات یکسر مختلف ہوتے۔ فینن نو آبادیاتی نظام کو ایک قسم کا تشدد خیال کرتا ہے جیسا کہ مشہور کہاوت ہے "لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے" البتہ فینن کے ہاں ایسے نو آبادکاروں اور سامراجیت کے اداروں کے لیے لچک ملتی ہے جو نو آبادیاتی نظام میں بربریت، ظلم اور استحصالی ہتھ کنڈوں کا حصہ نہیں بنتے۔ فینن کے بقول:

"نو آباد کار ہمیشہ ایسا انسان نہیں ہوتا جسے قتل کر دینا چاہیے۔ استعماریوں کے انبوہ میں بہت سے ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو قوم کے بعض سپوتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر قومی جدوجہد کے قریب ہوتے ہیں"۔(۵)

فینن نو آبادیاتی دور کی اقتصادی صورت حال کو پرکھنے کے لیے مقامی آبادی اور حکمرانوں کے متوسط طبقے کے افراد کی ذہنی حالت کا موازنہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق مقامی افراد کا متوسط طبقہ نو آبادکاروں کے متوسط طبقہ سے منسلک ہونے کو لازمی خیال کرتا ہے تاکہ نو آبادکاروں کے استعماری نظام کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا جاسکے یہی وہ طبقہ ہے جو اپنے مالیاتی مفادات کو برقرار رکھنے کے لیے نو آبادکاروں کے جاری کردہ استحصالی بیانیے کو جاری رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ فینن کے مطابق مقامی آبادی کے وہ افراد جو قومیت پر پکے ہوتے ہیں بعض اوقات وہ بھی سامراجیت کے بنائے ہوئے راستوں پر چل نکلتے ہیں اور نو آبادیاتی عہد کے خاتمے کے بعد بھی تسلیم شدہ حکومت میں بھی اسی کٹر قومیت کا متوسط طبقہ اپنی اجارہ داری پھیلانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتا رہا ہے۔ مزاحمت اور نو آبادیت کی مخالفت کے مختلف مدارج میں اس نکتہ کو نشان زد کیا جاسکتا ہے کہ مقامی آبادی کے متوسط طبقہ کی ذہنیت اور نفسیات پر عموماً سامراج اور استعماریت کے متوسط طبقہ کے اثرات کی واضح چھاپ موجود ہوتی ہے۔

اس متوسط طبقہ کے علاوہ وہ سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈران کا کردار بھی قابل ذکر ہے جو آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی بھی ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں۔ فینن ایسے کرداروں کو نشان زد کرتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ نئی قومی حکومت کے قائم ہوتے ہی ان سیاسی جماعتوں کے ان لیڈران کو رد استعماریت کے ایسے بیانیے وضع کرنے چاہیں جو نو آبادیاتی دور کے استحصال کے اثرات کو زائل کرنے میں مددگار ہوں۔ قومی تہذیب اور ثقافت، علمی و ادبی فکر کا فروغ ہی نئی آزاد ہونے والی ریاست کے افراد کو ان کی پرانی تہذیب و ثقافت، علمی و ادبی، سیاسی اور سماجی، معاشرتی و معاشی اور اقتصادی روایات سے منسلک ہونے اور قدیم قومی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے اور نو آبادکاروں کے مسخ کردہ حقائق اور شناخت کو از سر نو قائم کرنے کی کوشش کر سکتی ہے، فینن کے اپنے الفاظ کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"استعماریت محض مقبوضہ ملک کے حال اور مستقبل پر تسلط جمانے پر ہی قناعت نہیں کرتی، استعماریت صرف عوام کو اپنی گرفت میں لے کر اور مقامی باشندوں کے ذہن کو صورت اور معنی سے خالی کر کے ہی مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ ایک طرح کی غیر صحت مندانہ منطق سے کام لیتے ہوئے یہ مظلوم عوام کے پیچھے پڑ جاتی ہے اور اسے مسخ کر کے بدہیئت اور تباہ کر دیتی ہے"۔(۶)

فینن استعماریت اور نو آبادیاتی نظامی کی تہذیب و ثقافت کے منفی پہلوؤں سے بچنے کے لیے قومی تہذیب اور اپنی اصل ثقافتی جڑوں کو مضبوطی سے تھامے رکھنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے مطابق نو آبادیاتی دور میں مقامی ادیب و دانش ور بیک وقت دو تہذیبوں کے ہونے کی وجہ سے دوغلا پن کا شکار ہو جاتا ہے اور اسی دوغلے پن کے سبب ہمہ وقت دو شناختوں میں الجھ جاتا ہے۔ اردو ادب میں بہت سارے تخلیق کار اس الجھن میں گھرے نظر آتے ہیں اس الجھن کے سبب ادبی متون کافی پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں ادیب اور دانش وروں کی تخلیقی صلاحیتیں فطری اظہار سے معدوم ہو جاتی ہیں لیکن یہ کالی رات سدا نہیں رہتی بالآخر یہ بادل چھٹ جاتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ مزاحمتی اور رد استعماری رویے پروان چڑھتے ہیں تو ادیب اور تخلیق کار اپنی حقیقی اور فطری شناخت کا تعین کرنے اور واضح کرنے میں بالآخر کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ مزاحمتی رویے اور مزاحمتی بیانیے استعماریت اور سامراجیت کی اثر سے آزاد کرانے کے بعد کسی بھی مقامی آبادی کو اس کی اصل تہذیبی شناخت سے منسلک کرتے ہیں جو ان کی ذات اور مقام و مرتبے کا اصل اظہار کرتی ہے۔ فینن نو آبادیاتی دور میں لکھی جانے والی ادبی تحریروں کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے

1۔ ابتدائی دور کی ادبی تخلیقات جو نو آبادکاروں کی لائی ہوئی تہذیب و ثقافت کی مخالفت کی بجائے نو آبادیاتی تہذیب کو غیر مشروط انداز میں اپنے اندر جذب کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ نو آبادکاروں کے قریب ہونے کے لیے مقامی ادیب اور دانش ور نو آبادکاروں کے ادب سے براہ راست اثرات کو جذب کر کے انھی کے رنگ میں ڈھلنے کی کوشش کرتے رہے اور انھی کی طرز پہ ادب تخلیق کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس ضمن میں ہندوستان میں

انجمن پنجاب کا قیام اور اس پلیٹ فارم سے پیش کردہ نظمیہ شاعری کو جدید اردو نظم کے طور پر پیش کرنا عمدہ ترین مثال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی نظموں کے تراجم اور مقامی شاعری کو مغربی شاعری کے معیار پر پرکھنا، خود کی شاعری کو ناقص اور انگریزی شعرا کی شاعری کو برتر خیال کرنا بھی اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں جن کا اثر آج تک محسوس کیا جاسکتا ہے۔

2۔ نو آبادیاتی دور کے دوسرے دور میں ادیب اور دانش ور اپنی کھوئی ہوئی ساخت، شناخت اور گم شدہ حصوں کی دریافت اور دوبارہ بحالی کی کوشش کرتا ہے۔ ماضی کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے اور ماضی میں خود کو لے کر جا کر خود کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اس وقت احساس ہوتا ہے کہ غلامی واقعی ذلت اور پستی کا نام ہے وہ لمحے کسی نعمت سے کم نہ تھے جب استعماریت کا نام ونشاں تک نہ تھا۔ فینن کی تحریر کے مفہوم کی روشنی میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ:

> "بچپن کے گزرے ہوئے واقعات اس کی یادوں کی گہرائیوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ مستعار جمالیات اور دیگر آسمانوں کے نیچے دریافت شدہ نظریاتِ زندگی کی روشنی میں پرانے قصے کہانیوں کی نئی تعبیریں ہونے لگتی ہیں"۔(۷)

اس بیان کی روشنی میں بیسویں صدی کی ابتدائی قومی اور ملی نظم کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس پوری نظمیہ شاعری میں ماضی کا شکوہ اپنی جھلک پیش کرتا نظر آتا ہے۔ اس نظم میں طنز و مزاح، تمثیلی عناصر ادب میں مایوسی اور شکست جیسے تجربات کا ردعمل قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں نو آبادیاتی دور کے اس دوسرے ادبی عہد میں تمثیل نگاری کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے میدان میں اردو نظم کے علاوہ جس صنف نے اپنے حصہ ڈالا ان میں پنچ اخبار سرفہرست ہیں۔ خاص کر اودھ پنچ اخبار اس میں طنز و مزاح اور تمثیلی قصوں کو پروان چڑھانے میں نو آبادیاتی نظام کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور جاری کردہ تعزیروں اور قوانین نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ البتہ مقامی نظم گو شعرا میں اکبر الہٰ آبادی کی شاعری طنز اور مزاح کے پیرائے میں سامراجیت اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف علم بلند کرنے والے لوگوں میں صف اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

3۔ مزاحمتی بیانیے اور رد استعماریت کے زمرے میں نو آبادیاتی دور کا تیسرا اور آخری دور حقیقی طور پر ہی انقلاب اور بیداری کا دور تھا۔ اس دور میں حقیقی جنگجو، انقلاب اور قومی و ملی ادب تخلیق ہوتا ہے۔ فنون لطیفہ جیسا کہ مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ کے تمام فنون کے علاوہ شاعری کی جملہ اقسام جو نو آبادیاتی عہد کے ظلم و ستم، استحصال اور جبر کے سبب اپنا اصل رنگ ڈھنگ کھو چکی ہوتی ہیں۔ اس آخری دور میں سبھی دوبارہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آتے ہیں اور تہذیب و ثقافت کے قدیم رنگ بکھیرنا شروع کر دیتے ہیں اور چلتے چلتے اپنی قدیم روایت سے جڑ جاتے ہیں۔ اس دور میں پیدا ہونے والا ادبی ذوق داخلی جبر اور خارجی انتخاب کا مجسم ہوتا ہے۔ اس ذوق کے سبب تخلیقیت نئے رنگ اور آہنگ سے مزین ہو کر نمودار ہوتی ہے۔ وہ شعرا جو ابتدا میں نو آبادیاتی رعب اور دبدبے اور نو آبادیاتی بیانیے سے مرعوب و متاثر ہو کر نو آبادکاروں کے گن گاتے نظر آتے تھے، یکسر بدل جاتے ہیں اور اپنی شاعری عوامی مسائل کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ موضوعات بدل جاتے ہیں۔ عوامی مسائل کا چرچا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس دور کے مقامی ادبا و شعرا مقامی تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار کو ان کے ماضی کے جھروکوں سے نکال کر جدیدیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

فینن کے مطابق یہ دور نئی امنگوں اور امیدوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ ادیب کو مشورہ دیتا ہے کہ اس دور کے ادیب کو چاہیے کہ وہ ماضی کو مدنظر رکھتے ہوئے مستقبل کی پیش گوئی کرے اور مستقبل کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کرے، قوم کو ماضی کے اندھیروں میں دھکیلنے کی بجائے امید و یاس اور رجائیت کا راستہ دکھائے تاکہ مقامی آبادی خود کے قدموں پر کھڑا ہو سکے اور غلامی کا جو طوق انھوں نے گلے کا ہار بنا کر پہن رکھا ہے اس کو اتار پرے کریں اس حوالہ سے ہندوستان میں بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں لکھی جانے والی اردو نظم اس تیسرے عہد کی عکاس ہے۔ اس تیسرے اور آخری عہد کے نظم گو شعرا کی نظمیں جہاں اپنے ماضی اور مقامی ہیروز کی یادوں میں اپنائیت کا احساس دیتی ہے وہیں مزاحمت اور مزاحمتی بیانیوں کا تاثر دیتی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے منظوم ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے نو آبادکاروں اور نو آبادیاتی نظام کے اصول و قوانین، جبر، استحصال اور عفریت کے مخالف لہجہ سخت بہ آسانی سمجھ آتا ہے۔

نو آبادیاتی صورت حال جو کسی آبادی کی انفرادی شناخت اور قومی تہذیب و ثقافت کو ذہنی و جسمانی سطح پر کچلنے کے بعد اپنی شناخت اور تہذیب و ثقافت کا ملمع کرتی ہے۔ فینن اس ملمع کاری اور اس کے اثرات سے نجات کے لیے مقامی آبادی کی طرف سے مسلسل جدوجہد اور سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی، اور علمی و ادبی میدانوں میں قومی و ملی تہذیب و ثقافت اور روایات و اقدار کے شعور کو اجاگر کرنے پر بھرپور زور دیتا ہے۔ اس کی فکر نو آبادکاروں کے وضع کردہ ان تمام سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی و ادبی اور معاشرتی بیانیوں کی چھان بین کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ واضح رہے کہ نو آبادکار کی طرف سے ایسے بیانیوں کا مقصد صرف اور صرف مقامی سطح پر آبادی کے افراد میں شناخت کے حوالہ سے احساس کم تری پیدا کرنا اور اس احساس کے سبب اپنے اقتدار کو عروج دینا اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔ فینن نے مغربی نو آبادکاروں کے انھی منافقانہ رویوں اور معاشی وسائل پر اپنی اجادہ داری کی تدبیروں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے اپنی اس فکر سے محکوم قوموں کو اپنی تہذیبی و ثقافتی جڑوں کی تلاش اور دریافت پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ فینن کے ہاں موجود اس نو آبادیاتی نظام کو اس کے معروضی سیاق و سباق میں دیکھتے ہوئے مزاحمت اور مزاحمتی بیانیوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اردو زبان و ادب میں پس نو آبادیاتی مطالعہ کرتے ہوئے فینن کی فکر اور نظریاتی پختگی کو مد نظر رکھنا فکر و فن کے حوالہ سے نئے زاویے اور نئی راہیں دکھا سکتی ہے۔

اردو زبان و ادب کی تنقید کی تفہیم اور فروغ میں گوپی چند نارنگ، ابو الکلام قاسمی، قاضی افضال حسین، وہاب اشرفی، شافع قدوائی، ڈاکٹر وزیر آغا، قمر جمیل، فہیم اعظمی، ضمیر بدایونی، اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے نام قابل تحسین اور قابل داد ہیں۔

حوالہ جات

1. Young,J.C: Post colonialism:A very short introduction 129

2. Francis Maspero, Toward the African Revolution (Frantz Fanon) New York Grove press, ء1994,P 7

۳۔ فینن فرانز "افتادگان خاک" مترجم: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، لاہور، نگارشات، مارچ 1949ء، ص:۵۰

۴۔ ایضاً، ص:۶

۵۔ ایضاً، ص:۱۰۵

۶۔ ایضاً، ص:۲۰

۷۔ ایضاً، ص:۱۸۵